TAHREER
Journal of Languages & Literature
eISSN:3007-2085
pISSN:3007-2077
تحریر
Vol. 4 No. 1 (2026) HEC approved in the Y category.

Religious and Cultural Conflict in the Pakistani Urdu Novel: A Critical Analysis of Identity, Existentialism, and Socio-Political Discourse

پاکستانی اردو ناول میں مذہبی اور ثقافتی کشمکش: شناخت، وجودیت، اور سماجی و سیاسی بیانیے کا تنقیدی تجزیہ

Muhammad Mujahid Mahmood[1*], Dr Shahida Yusuf[2]
[1]PhD Scholar, [2]Associate Professor, Urdu Department, Riphah International University, Faisalabad,
***Corresponding Email:** mmm.phdriuf@gmail.com

Abstract
This study examines the central theme of *religious–cultural conflict* in Pakistani Urdu literature, positioning it as a defining element of South Asian literary consciousness. In the subcontinent, religion has historically operated as a collective force shaping socio-political identities rather than a purely personal belief system. The research traces this conflict across two phases: the pre-partition struggle between Hindu and Muslim civilisations, and the post-partition tensions among Islamic tradition, Western modernity, and divergent sectarian interpretations. Through qualitative textual analysis, the study explores existential and spiritual intersections in Abdullah Hussain's *Udaas Naslein*, psychological fragmentation in Qurratulain Hyder's *Aag Ka Darya*, and the clash between rationality and superstition in Anis Nagi's *Putliyan*. It also investigates Mustansar Hussain Tarar's portrayal of *jihad* as a shifting spiritual and geopolitical construct. The findings affirm the Pakistani Urdu novel as a vital socio-historical archive documenting evolving negotiations of faith, identity, and cultural survival.

Keywords:
Pakistani Urdu Novel, Religious-Cultural Conflict, Post-colonial Literature, Identity Crisis, Existentialism, South Asian History, Abdullah Hussain, Qurratulain Hyder, Mustansar Hussain Tarar, Modernity vs. Tradition, Socio-Cultural Discourse.

Received: 28-12-2025 **Accepted:** 05-02-2026 **Online:** 14-02-2026

This article is licensed under the Creative Commons Attribution (CC BY 4.0).
Free use, distribution, and reproduction permitted with proper citation of the original work.
© The Author(s).

پاکستانی اردو ناولوں میں مذہبی تہذیبی آویزش ایک نہایت اہم اور بنیادی موضوع کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ برصغیر کی تاریخ اور سماج میں مذہب ہمیشہ ایک مرکزی کردار ادا کرتا رہا ہے۔ تقسیم ہند سے قبل کے ناولوں میں مسلمان اور ہندو معاشروں کے درمیان مذہبی اور

تہذیبی فاصلے کو نمایاں طور پر پیش کیا گیا، جہاں ایک طرف مسلمانوں کی اسلامی اقدار، رسومات اور تہذیبی شعائر تھے تو دوسری طرف ہندو معاشرت اپنی روایات اور رسوم کے ساتھ موجود تھی۔ یہ آویزش صرف عبادات یا مذہبی شعائر کی سطح پر نہیں تھی بلکہ طرزِ زندگی، رہن سہن، زبان، لباس، شادی بیاہ کے طریقوں اور روزمرہ کی معاشرتی اقدار میں بھی جھلکتی تھی۔ پاکستانی اردو ناولوں میں اس تہذیبی کشمکش کو نہایت باریک بینی سے اجاگر کیا گیا ہے، تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ قیام پاکستان کا محرک صرف سیاسی یا جغرافیائی ضرورت نہیں تھا بلکہ یہ تہذیبی بقا کی جدوجہد بھی تھی۔ ان ناولوں میں دکھایا گیا کہ کس طرح مسلمانوں نے اپنے مذہبی تشخص کو محفوظ رکھنے کے لیے ایک الگ ریاست کا مطالبہ کیا، کیونکہ متحدہ ہندوستان میں ہندو اکثریت کے غلبے کے ساتھ ان کی زبان، مذہب اور کلچر مسلسل دباؤ میں آ رہے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد لکھے گئے ناولوں میں یہ آویزش ایک نئے رخ سے سامنے آتی ہے، جہاں مسلمان اپنی اسلامی اقدار کے فروغ کے ساتھ ساتھ جدیدیت اور مغربی اثرات کے درمیان الجھے نظر آتے ہیں۔ یہاں مذہب کو نہ صرف ایک روحانی سہارا بلکہ معاشرتی نظم و ضبط اور اخلاقی اقدار کے ضابطے کے طور پر بھی پیش کیا گیا۔ بعض ناولوں میں مذہب کو عوامی سطح پر ایک طاقتور جذبے کے طور پر دکھایا گیا جو قربانی، ایثار اور وحدت پیدا کرتا ہے، مگر ساتھ ہی کہیں کہیں مذہب کے نام پر ہونے والی شدت پسندی اور فرقہ واریت کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ اس طرح مذہبی تہذیبی آویزش صرف ہندو مسلم کشمکش تک محدود نہیں رہتی بلکہ پاکستان کے اندر بھی مختلف مسالک اور مذہبی تعبیرات کے درمیان تناؤ کی صورت میں ابھرتی ہے۔ اردو ناول نگاروں نے ان پہلوؤں کو محض واقعاتی یا بیانی انداز میں بیان نہیں کیا بلکہ کرداروں کی زندگیوں کے ذریعے مذہب کی مختلف تعبیرات کو دکھایا ہے۔ ان کرداروں کی داخلی کشمکش اور خارجی رویے اس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ مذہب کس طرح فرد اور معاشرتی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ مذہبی تہذیبی آویزش کے تناظر میں اردو ناول نہ صرف ایک ادبی دستاویز بنتے ہیں بلکہ تاریخی، معاشرتی اور تہذیبی شعور کا آئینہ بھی فراہم کرتے ہیں۔ ان میں ایک طرف مذہب کے ذریعے شناخت اور وابستگی کا تصور ابھرتا ہے اور دوسری طرف مذہبی آویزش کے منفی اثرات جیسے تعصب، تقسیم اور انتشار کو بھی دکھایا جاتا ہے۔ یوں پاکستانی اردو ناولوں میں مذہبی تہذیبی آویزش محض ایک موضوع نہیں بلکہ ایک زندہ حقیقت کے طور پر سامنے آتی ہے جو ماضی کی یادوں سے لے کر حال کے مسائل اور مستقبل کی تشکیل تک ایک ہمہ گیر حیثیت رکھتی ہے۔

عبداللہ حسین کے شہرہ آفاق ناول "اداس نسلیں" میں مذہبی آویزش ایک مرکزی موضوع کے طور پر نمایاں ہے۔ اس ناول میں مذہب کے حوالے سے جو فلسفیانہ بحث سامنے آتی ہے، وہ زیادہ تر مذہبی فکر کے قریب تر ہے اور انسانی ضمیر، اخلاق اور وجودی سوالات کے گرد گھومتی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار نعیم، مزاج اور نفسیاتی پہلوؤں کے لحاظ سے البرٹ کامیو کے مشہور ناول "آؤٹ سائیڈر" کے مرکزی کردار مورسال سے مشابہت رکھتا ہے۔ مورسال کا کردار ایسے شخص کی تصویر پیش کرتا ہے جو مذہب اور وجودی فکر کے زیر اثر، شعوری طور پر تراشا گیا ہے۔ یہ کردار اپنے اعمال کو سوچے سمجھے بغیر انجام دیتا ہے، اور اس کے ارادوں یا مستقبل کے فیصلوں کے بارے میں کوئی پیش

گوئی ممکن نہیں۔ وہ بعض اوقات ایسے اقدامات کرتا ہے جن کا نتیجہ یا ضرورت وہ خود بھی نہیں سمجھ پاتا، جیسے ایک واقعہ میں وہ کسی عرب کو قتل کر دیتا ہے، مگر اس قتل کے انجام یا اس کے اثرات کے بارے میں وہ خود لاعلم ہوتا ہے۔ اس رویے میں انسانی بے خبری، اخلاقی سوالات اور وجودی تفکر کی جھلک واضح ہوتی ہے۔ اسی طرح نعیم کا کردار بھی ایک ایسے نوجوان کی عکاسی کرتا ہے جو مذہبی اور سماجی اقدار کے درمیان پھنس گیا ہے اور اپنے فیصلوں میں اکثر غیر یقینی یا متضاد مزاج کا مظاہرہ کرتا ہے۔ نعیم بعض معاملات میں اپنے ارادوں کے سبب یا ضرورت سے زیادہ فکر نہ کرتے ہوئے فیصلے کرتا ہے، جیسے وہ قردونہ سے شادی کر لیتا ہے، حالانکہ یہ فیصلہ بنیادی طور پر قردونہ کی خواہش اور اس کی مدد کے جذبے کی بنیاد پر ہوتا ہے، نہ کہ کوئی گہری سوچ یا ذاتی منصوبہ بندی کے تحت۔ اس تناظر میں "اداس نسلیں" میں مذہبی آویزش، وجودی فکر اور انسانی شعور کے درمیان کشمکش کو نہایت مہارت سے پیش کیا گیا ہے، اور قاری کو انسانی فطرت، اخلاقی تضادات اور مذہبی شعور کے پیچیدہ تعلقات پر غور کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ یوں یہ ناول صرف ایک کہانی نہیں بلکہ ایک فلسفیانہ مطالعہ بھی ہے، جو مذہب، وجودی سوالات اور اخلاقی ذمہ داریوں کے درمیان پیدا ہونے والی کشمکش کو نہایت باریک بینی سے اجاگر کرتا ہے۔

ناول "اداس نسلیں" میں نعیم کے کردار کی داخلی کشمکش اور اس کی زندگی میں مذہبی و وجودی آویزش نہایت باریک بینی سے پیش کی گئی ہے۔ جب شیلا نعیم کے سامنے اپنے جذبات اور شادی کی خواہش کا اظہار کرتی ہے، تو وہ اس کے رنگین اور ریشمی انداز سے متاثر ہو کر اس کی باتوں کو دل ہی دل میں قبول کرتا ہے اور متعدد خواہشات اپنے اندر جنم لینے دیتا ہے۔ تاہم، یہ خوشیاں زیادہ دیر قائم نہیں رہتیں؛ نعیم جلد ہی شیلا کو چھوڑ دیتا ہے اور ایک سپاہی کو قتل کر بیٹھتا ہے، جو اس کے ابتدائی ارادے میں شامل نہیں تھا۔ اس کے بعد وہ بغیر سوچے سمجھے ایک خفیہ تنظیم میں شامل ہو جاتا ہے، جو دراصل گانگرس کی سیاسی اور مضموم مقاصد کی حامل تنظیم ہوتی ہے، اور اس کی شمولیت اسے جان کے خطرات میں ڈال دیتی ہے۔ اس دوران نعیم موت کے خوف، ذات کی شکست و ریخت، ناامیدی اور کم مائیگی جیسے جذبات میں گھرا رہتا ہے۔ اس بحران کے دوران عذرا، ایک کردار کے طور پر، اسے سپورٹ فراہم کرتی ہے اور اسے ری ہیبی لی ٹیشن سنٹر لے جاتی ہے جہاں اس کا جسمانی اور نفسیاتی علاج کیا جاتا ہے۔ عذرا نہ صرف جسمانی علاج کرواتی ہے بلکہ نعیم کو ذہنی سکون دینے کے لیے تسلی اور دلاسے بھی فراہم کرتی ہے۔ اس عرصے میں نعیم کی ملاقات ڈاکٹر انصاری سے ہوتی ہے، جو پیشے کے لحاظ سے تو ڈاکٹر ہے مگر مذہبی فکر کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر انصاری نعیم کو مذہبی اور روحانی فکر سے روشناس کرواتے ہیں، جو وجودی فکر کے ساتھ ہم آہنگ نظر آتی ہے اور تصوف کے فلسفیانہ اصولوں سے جڑی ہوئی ہے۔ وہ نعیم کو اپنے وجود کی شناخت اور روحانی آگاہی کے ذریعے زندگی میں توازن قائم کرنے کا مشورہ دیتے ہیں، تاکہ وہ اپنی نفسیاتی اور اخلاقی کشمکش سے باہر نکل سکے۔ اس طرح ناول میں نعیم کی زندگی میں مذہبی اور روحانی آویزش کے مراحل، اس کے داخلی تضادات اور انسان کی ذات کی تلاش کو نہایت فنی انداز میں پیش کیا گیا ہے، اور یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عبداللہ حسین نے انسانی وجود کی پیچیدگی اور روحانی رجحانات کو ادبی تخیل کے ساتھ ملا کر ایک متوازن اور فلسفیانہ مطالعہ پیش کیا۔ نعیم سے گفتگو کے دوران ڈاکٹر انصاری کہتا ہے:

"مذہب کا سب سے اہم اور بنیادی آلہ عبادت ہے، کیونکہ عبادت انسان کی شخصیت کے ہر پہلو کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ایک گہرا جذبہ بن جاتی ہے۔ یہ جذبہ انسان کو اپنے باطن میں جھانکنے، اپنی ذات کو سمجھنے اور خود آگاہی حاصل کرنے کی استطاعت فراہم کرتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جس کسی نے بھی حقیقی معنوں میں اپنے آپ کو پہچانا، اس کی بنیاد عبادت اور روحانی ریاضت ہی رہی ہے۔ عبادت ایک ایسا راستہ ہے جو انسان کو دنیا کی سیر و گشت کے بعد، آخر کار خود اپنی ذات تک پہنچنے کا موقع دیتا ہے۔ یہ راستہ خفیہ، تنگ اور مشکل ضرور ہوتا ہے، لیکن یہ انسان کو اپنے باطن کی گہرائیوں تک لے جاتا ہے، جہاں وہ اپنے خوف، اضطراب اور شک و تردید سے روبرو ہوتا ہے۔ جب آدمی اس داخلی سفر میں آگے بڑھتا ہے اور اپنی روحانی حدوں کو چھوتا ہے، تو وہ ایک آفاقی سطح تک پہنچتا ہے، جہاں نہ صرف اپنے وجود کو سمجھنا ممکن ہوتا ہے بلکہ ماورائی حقائق اور کائناتی حقیقتوں کو بھی دیکھنے اور جاننے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ یوں عبادت انسان کو صرف مذہبی فریضہ ادا کرنے کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک فلسفیانہ اور روحانی سفر فراہم کرتی ہے، جو اسے خود آگاہی، اخلاقی استحکام اور روحانی کمال تک لے جاتا ہے۔۔"(1)

مذہب کا سب سے بڑا آلہ عبادت ہے۔ عبادت انسان کے لیے صرف ایک رسمی یا روایتی عمل نہیں بلکہ ایک ایسی داخلی کیفیت ہے جو اس کی شخصیت کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر اسے اپنی حقیقت سے روشناس کراتی ہے۔ یہ انسان کو اپنے اندر جھانکنے اور اپنی ذات کی گہرائیوں میں اترنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے۔ انسانی تاریخ کے ہر دور میں جس کسی نے بھی اپنی ذات کو پہچانا اور کائنات کے رازوں تک رسائی حاصل کی، وہ اسی عبادت کی بدولت تھا۔ عبادت انسان کو ایک ایسے سفر پر لے جاتی ہے جس میں وہ باہر کی دنیا میں گھومنے کے باوجود آخر کار اپنی ہی ذات تک لوٹ آتا ہے۔ یہی وہ خفیہ اور باریک راستہ ہے جو انسان کو اس کے باطن تک پہنچاتا ہے، اور جب وہ اپنی ذات کی تہوں میں اترتا ہے تو آفاقی سطح پر ایسے در کھلنے لگتے ہیں جن کے ذریعے وہ ماورائی حقائق کو دیکھنے اور سمجھنے لگتا ہے یہی نقطہ مذہبی تہذیبی آویزش کی بنیاد بھی ہے۔ ایک طرف مذہب عبادت کے ذریعے انسان کو روحانی ارتقاء، اخلاقی بالیدگی اور باطنی سکون کی راہ پر ڈالتا ہے، جبکہ دوسری طرف جدید مادیت پرست تہذیب انسان کو خارجی دنیا کی لذتوں، ظاہری ترقی اور وقتی آسائشوں میں الجھا دیتی ہے۔ یوں انسان دو متضاد کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے: ایک طرف وہ اپنی ذات کو پہچاننے اور اپنے رب تک رسائی حاصل کرنے کے سفر میں ہوتا ہے، اور دوسری طرف وہ دنیاوی تمدن اور تہذیبی رجحانات میں محصور کر دیا جاتا ہے یہی تضاد دراصل مذہبی تہذیبی آویزش کی جڑ ہے۔ مذہب انسان کو ایک ایسی وحدت، ہم آہنگی اور روحانی سچائی عطا کرتا ہے جو اسے فرد سے آگے بڑھا کر اجتماعی سطح پر ایک مکمل تہذیب کی صورت میں ڈھال دیتا ہے۔ دوسری طرف مغربی اور مادہ پرست تہذیبیں عبادت کے اس روحانی اور تخلیقی عمل کو محض ایک محدود اور بے اثر رسم قرار دیتی ہیں، اور یوں وہ انسان کو اپنے خالق سے دور کرنے کی کوشش کرتی ہیں نتیجتاً عبادت کا تصور ایک تہذیبی مزاحمت اور آویزش کی علامت بن جاتا ہے یوں کہا جا سکتا ہے کہ عبادت نہ صرف مذہب کی بنیاد ہے بلکہ تہذیبوں کے مابین کشمکش کا ایک مرکزی نکتہ بھی ہے۔ جب مسلمان تہذیب اپنی

عبادات کے ذریعے روحانیت اور اخلاقی تطہیر کو زندگی کا حصہ بناتی ہے تو اس کے بالمقابل غیر مذہبی یا لادینی تہذیبیں انسان کو مادیت، لذت پرستی اور خود غرضی کی راہ پر ڈالتی ہیں۔ یہی باہمی تصادم مذہبی تہذیبی آویزش کی شکل اختیار کرتا ہے جو فرد کی سطح سے شروع ہو کر اجتماعی سطح تک پھیل جاتا ہے۔

مذہبی تہذیبی آویزش کے مطالعے میں یہ نکتہ نہایت اہم ہے کہ انسانی تخیل اپنی فطرت میں بے سمت نہیں رہ سکتا۔ جیسا کہ اقتباس میں کہا گیا ہے: "تخیل کو تم بغیر کسی وجہ کے عمل میں نہیں لا سکتے، خیالات کی بنیاد Nothingness پر نہیں رکھ سکتے"۔ دراصل یہ بات مذہبی فکر اور تہذیبی رویوں پر بھی پوری طرح صادق آتی ہے۔ جب کسی معاشرے کو اپنے وجود کی کوئی معقول دلیل، کوئی نظریاتی جواز یا کوئی تہذیبی بنیاد میسر نہ ہو تو اس کے تخیلات، عقائد اور رویے تیزی سے بکھراؤ اور انتشار کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں جتنے بھی مذہبی و تہذیبی تصادم سامنے آئے، ان میں تخیل کو ایک متعین سمت دینے کے لیے کسی نہ کسی بڑے بیانیے (Grand Narrative) کا سہارا لیا گیا، تاکہ افراد اپنے وجود اور اعمال کو بے معنویت کی بجائے ایک اعلیٰ مقصد سے جوڑ سکیں اسلامی تہذیب کی مثال لی جائے تو قرآن مجید نے انسان کے وجود اور اس کی غایت کو واضح کر کے اس کے خیالات اور اعمال کو سمت عطا کی: "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ" (الذاریات: 56)۔ یہ آیت دراصل وہ "وجودی دلیل" فراہم کرتی ہے جس کے بغیر انسانی تخیل بیکار ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی فکر نے محض خیالی یا تصوری سطح پر انسان کو نہیں چھوڑا بلکہ اس کے وجود کے مقاصد، اس کی ذمہ داریوں اور اجتماعی کردار کو ایک واضح شکل دی۔ اس کے برعکس جب کوئی تہذیب یا مذہب اپنے پیروکاروں کو ایسی دلیل اور سمت دینے میں ناکام رہتا ہے تو وہاں خیالات کی بے ربطی شدت پسندی، الحاد یا روحانی بحران کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے پاکستان کے تناظر میں بھی یہ بات واضح ہے کہ قیامِ پاکستان ایک نظریاتی دلیل کے بغیر ممکن نہ تھا۔ مسلمانوں کے لیے "اسلامی تہذیب" وہ بنیاد تھی جس نے ان کے تخیل کو جواز اور سمت بخشی۔ اگر مسلمانوں کو اپنی شناخت، دین اور ثقافتی وجود کے بقا کا سوال نہ ہوتا تو ان کے خیالات بکھر کر کسی ایک مقصد پر مجتمع نہ ہو پاتے۔ اسی لیے "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ" کا نعرہ تخیل کو ایک متعین سمت دینے والا جواز بن گیا۔ اس نعرے نے محض سیاسی آزادی کا نہیں بلکہ ایک مذہبی تہذیبی وجود کے تحفظ کا وعدہ کیا، اور اسی بنیاد پر لاکھوں افراد نے اپنی زندگیاں قربان کیں مذہبی تہذیبی آویزش کے مطالعے میں یہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ جب کسی مذہبی جماعت یا تحریک اپنے پیروکاروں کو "وجود کی اصلیت" سے آگاہ کرنے میں کامیاب ہوتی ہے تو ان کا تخیل غیر معمولی قوت اختیار کر لیتا ہے۔ یہی تخیل آگے چل کر اجتماعی شعور کو شکل دیتا ہے، جبکہ اس کے برعکس بے جواز اور بے بنیاد تخیل محض خواب و خیال بن کر رہ جاتا ہے جو بالآخر معاشرتی انارکی کا سبب بنتا ہے۔

مذہبی فکر رکھنے والے دو مفکرین بالخصوص کارل جوسفر اور گارئیل مارشل اپنے وجود کی شناخت کے معاملے میں مذہب کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ وہ عرفانِ ذات کے باب میں روحانیت کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اگر اپنی ذات سے آگاہی حاصل کرنی ہے تو

اس کے لئے کوئی منطق یا سائنس مدد نہیں کر سکتی بلکہ روحانیت وجدان ہی ایک ایسی چیز ہے جو آپ کو آپ کے داخل سے ملا سکتی ہے۔

اپنے بچپن میں ہندو مسلم اختلافات سے بے خبر رہ کر بنارس کی گلیوں، مندروں اور گھاٹوں کو اپنا سمجھتی تھیں۔ان کی دوست ہندو تھی مگر دونوں ایک جیسی فضا میں پلتی بڑھتی تھیں۔ جیسے ہی وہ بڑی ہوئیں تو انہیں احساس دلایا گیا کہ ان کی شناخت مذہب کی بنیاد پر مختلف ہے۔ کیونکہ وہ ہندو رسومات میں شریک نہیں ہوتیں بلکہ ان کا گھر اسلامی عبادات سے جڑا ہوا ہے۔اسی بنیاد پر ان کے وجود کو دوسرا سمجھا جانے لگا یوں اگرچہ وہ ہندوستان کی شہری ہیں، قومی ترانہ بھی گاتی ہیں اور خود کو اسی ملک کا حصہ سمجھتی ہیں، لیکن اکثریت کی نظر میں ان کی حیثیت ایک اجنبی کی سی رہتی ہے۔اس احساسِ اجنبیت نے ان کے اندر یہ سوال پیدا کیا کہ آخر وہ کہاں کی ہیں اور اپنی اصل وابستگی کہاں ڈھونڈیں۔ کمال کراچی میں رہائش اختیار کرنے کے بعد طلعت کو جو طویل خط لکھتا ہے، اس کے متن پر غور کیا جائے تو بعض اہم نکات کی نشان دہی ہوتی ہے۔ جن سے ناول کا پس منظری نہیں پیش منظر بھی قاری کی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ قیام پاکستان کے زمانے میں یہاں جو مذہبی رویے فروغ پا رہے تھے، ریاست کو جو ایک مخصوص شکل دینے کی کوشش کی جارہی تھی، ناول نگار نے انہیں پہچانے میں کوئی غلطی نہیں کی:

> "اسلام، اس لفظ کی جو گت بنی ہے (کرکٹ میچ میں پاکستانی ٹیم ہارنے لگے، تو سمجھو اسلام خطرے میں ہے!) دنیا کے ہر مسئلے کی تان آخر میں آکر ہی لفظ پر ٹوٹتی ہے، دوسرے مسلمان ملک اس بات پر خوب چڑتے ہیں ساری دنیا کی طرف سے اسلام کا ٹھیکا اس وقت ان لوگوں نے لے رکھا ہے۔ ہر چیز پر تنگ نظری کا غلاف چڑھا ہوا ہے۔ موسیقی، آرٹ، تہذیب، علم و ادب سب کو ملا کی نظر سے دیکھا جارہا ہے۔ اسلام جو ایک چڑھتے ہوئے دریا کی طرح ان گنت معاون ندی نالوں کو اپنے دھارے میں لپیٹ کر ایک عظیم آب شار کی صورت میں رواں ہوا تھا، اب وہ سمٹ سمٹا کر ایک مٹیالے نالے میں تبدیل کیا جارہا ہے۔ نالہ ایک وسیع بٹیر میں بہہ رہا ہے۔ جس میں چاروں طرف سے بند باندھے جارہے ہیں۔ لطیفہ یہ کہ اسلام کا نعرہ لگانے والوں کو فلسفہ و مذہب سے قطعی کوئی سروکار نہیں ہے۔ اُن کو صرف اتنا معلوم ہے کہ مسلمانوں نے آٹھ سو سال عیسائی سپین پر حکومت کی ایک ہزار سال تک ہندو بھارت پر عثمانیوں نے صدیوں تک مشرقی یورپ کو تابع رکھا۔ امپیریلزم کے علاوہ اسلام کی جو عظیم انسان پرستی کی روایات ہیں۔ ان کا تذکرہ نہیں کیا جاتا۔ عرب حکماء ایرانی شعراء اور ہندوستانی صوفیائے کرام کی وسیع القلمی کا چرچا کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی علی اور حسین کے فلسفے سے کوئی غرض نہیں۔ اسلام کو ایک نہایت جارحانہ مذہب اور طرز زندگی بنا کر پیش کیا جارہا ہے۔"(2)

یہ اقتباس برصغیر کی تقسیم کے بعد مسلمانوں کی نفسیاتی و معاشرتی کیفیت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مذہبی آویزش کی عکاسی کرتا ہے۔ تقسیم ہند نے صرف سرحدیں ہی نہیں بدلیں بلکہ خاندانوں کو بھی توڑ دیا۔ ایک ہی گھر کے افراد مختلف ملکوں اور مختلف

اداروں میں بٹ گئے، جس سے وفاداری اور اعتماد کا بحران پیدا ہوا۔ مسلمان نوجوان جب یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل ہو کر عملی زندگی میں قدم رکھتے تو ان کے سامنے سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ ہندوستانی ریاست ان کی وفاداری پر شکوک کرتی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہندوستانی فوج یا ائیر فورس میں جانے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ ان پر ہمیشہ "پاکستان نوازی" کا دھبہ لگنے کا اندیشہ رہتا۔ یہ صورتحال مذہبی آویزش کی سب سے نمایاں مثال ہے کہ محض مذہب کی بنیاد پر انسان کی صلاحیت اور محنت پس منظر میں چلی جاتی اور اس کی وفاداری مشکوک سمجھی جاتی دوسری طرف مسلمانوں کے دل میں بھی ایک احساس محرومی جڑ پکڑ چکا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر مقابلے کے امتحانات میں شریک بھی ہوں تو محنتی ہندو طلبہ ان پر سبقت لے جائیں گے، اور اگر کسی طرح کامیاب بھی ہو جائیں تو ہندو افسران کے تعصب کی وجہ سے ان کا انتخاب ممکن نہ ہوگا۔ یوں مذہبی تقسیم نے صرف معاشرتی ڈھانچے کو نہیں توڑا بلکہ مسلمانوں کے اندر احساس کمتری اور غیر یقینی کی فضا بھی پیدا کی۔ نتیجتاً مسلمان نوجوان یہ سوچنے لگے کہ ہندوستان ان کے لیے مستقل وطن نہیں بلکہ محض ایک عارضی پڑاؤ ہے۔ یہ وہ ذہنی کیفیت تھی جس نے علی گڑھ کی کہاوت کو جنم دیا کہ "مسلم یونیورسٹی کی سڑک نئی دہلی کے بجائے سیدھی کراچی جاتی ہے اس مذہبی آویزش کے نتیجے میں تعلیم یافتہ مسلمان اپنی صلاحیتیں ہند کی ریاستی اداروں کو دینے کے بجائے پاکستان منتقل کرنے میں عافیت سمجھتے۔ اس سے ایک طرف ہندوستانی ریاستی ادارے مسلمانوں سے محروم ہوتے گئے اور دوسری طرف مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ تاثر پختہ ہوتا گیا کہ وہ اس سرزمین کے مستقل اور برابر کے شہری نہیں۔ اس نفسیاتی اور سماجی دوراہے نے دونوں قوموں کے درمیان فاصلے مزید بڑھا دیے یوں یہ اقتباس اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ مذہبی آویزش صرف نظریاتی یا اعتقادی معاملہ نہیں تھی بلکہ اس نے عملی زندگی، ملازمتوں، تعلیمی اداروں اور حتیٰ کہ خاندانوں کو بھی متاثر کیا۔ مسلمانوں کی ذہنی کشمکش اور ہندو اکثریت کا تعصب مل کر اس تقسیم کو مزید گہرا کرتے گئے، جو آخر کار برصغیر کے دو الگ ملکوں میں بدلنے کی بنیاد بنی۔ مزید اس بات سے اندازہ ہو جائے گا:

> "اتر پردیش کا وہ مسلمان، جو مسلمانوں کی مڈل کلاس سیاست اور تہذیب کا علم بردار تھا، نہ ادھر کا رہا نہ ادھر کا۔ اُس کی حالت قابل رحم ہے۔"(3)

> "علی گڑھ میں کہاوت ہے کہ مسلم یونی ورسٹی کی سڑک نئی دلی کی بجائے سیدھی کراچی جاتی ہے۔"(4)

انیس ناگی کے ناول پتلیاں میں پیش کیا گیا یہ منظر اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی معاشرتی دباؤ اور سماجی فضا کے اثرات کے تحت ایسے رویوں کا شکار ہو جاتا ہے جو اس کی عقل و دانش کے بالکل برعکس ہوتے ہیں۔ مرکزی کردار جب یہ کہتا ہے کہ وہ پڑھ لکھ کر کتنا بے وقوف ہے اور بیوی کے کہنے پر اس جگہ چلا آیا ہے جہاں تعلیم، عقلیت اور شعور کی نفی ہوتی ہے تو دراصل وہ اس ذہنی و تہذیبی کشمکش کو بیان کر رہا ہے جو ایک طرف جدید تعلیم اور فلسفیانہ شعور کی نمائندگی کرتی ہے اور دوسری طرف معاشرتی طور پر رائج توہم پرستی، تعویز دھاگوں اور جعلی روحانیت پر مبنی ہے یہ کشمکش صرف فرد کی سطح پر نہیں بلکہ پورے معاشرے کی فکری صورتِ حال کی نمائندگی

کرتی ہے۔ایک طرف فلسفہ، سائنس اور جدیدیت پر مبنی عقلیت ہے جو تحقیق، تجربے اور دلیل کو اہمیت دیتی ہے۔دوسری طرف عوامی سطح پر راسخ عقائد اور مذہب کے نام پر قائم ایسے کاروبار ہیں جو "روحانی علاج" کے نام پر چلائے جارہے ہیں۔یہ بات اس امر کو ظاہر کرتی ہے کہ مذہب اور روحانیت کو کس طرح ایک منافع بخش کاروبار بنادیا گیا ہے انیس ناگی اس منظر کے ذریعے پاکستانی معاشرت میں مذہبی تہذیبی آویزش کی حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں۔ یہاں ایک طرف عقلی اور سائنسی شعور رکھنے والا طبقہ ہے جو سوال اٹھاتا ہے کہ اگر ان پیروں اور عاملوں کو پیسے کی لالچ نہیں تو پھر یہ کاروبار کیسے چل رہا ہے؟اور دوسری طرف وہ عوام ہیں جو اپنی مشکلات اور محرومیوں کے حل کے لیے ان پیرانِ کرام کے درباروں اور کوٹھیوں کا رخ کرتے ہیں۔یوں مذہب کی اصل روح پیچھے چلی جاتی ہے اور اس کی جگہ ایک ایسا معاشرتی ڈھانچہ ابھرتا ہے جس میں عقیدت، سادہ لوحی اور استحصال یکجا ہو جاتے ہیں یہی مذہبی تہذیبی آویزش ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ اپنی عقلیت اور فلسفیانہ علم کے باوجود معاشرتی دباؤ اور خاندانی دباؤ کے تحت اسی توہم پرستانہ ماحول کا حصہ بننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔عورت (بیوی) کا کردار اس میں اہم ہے کیونکہ وہ عقلی استدلال کے بجائے روحانی علاج اور تعویز دھاگے کو ترجیح دیتی ہے۔ مرد و عورت دونوں کی سطح پر جدیدیت اور قدامت پسندی کی کشمکش معاشرتی سطح پر مستقل جاری ہے انیس ناگی کا یہ اسلوب اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ مذہب کا ایک پہلو روحانی تسکین اور اخلاقی رہنمائی کا ہے، لیکن جب وہ طبقاتی مفادات اور معاشی لالچ سے جڑ جاتا ہے تو اس کے اندر تضادات اور آویزشی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔اس تضاد کو ہی تہذیبی آویزش کہا جاسکتا ہے جو پتلیاں میں بار بار مختلف صورتوں میں سامنے آتا ہے۔

ہندو مذہب میں اس طرح کے مسائل پر ڈاکٹر ارشد اقبال یوں کہتے ہیں:

> "انگریزی دور حکومت سے قبل ذات پات کی بنیاد پر اور تقسیم کی بناء پر ہندوؤں میں محض برہمن ہی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ جن کا ذریعہ تعلیم سنسکرت زبان تھی ان کی تعلیم عام طور پر مذہبی کتب تک محدود رہتی تھی۔ کیونکہ برہمنوں کا پیشہ مذہبی رسوم کی نگرانی یا انھیں انجام تک پہنچانا ہوتا تھا۔"(5)

ہندو مذہب میں صدیوں تک صرف ایک خاص طبقے یعنی برہمنوں کو مذہبی علم حاصل کرنے کی اجازت تھی۔ باقی تمام طبقات کو علم کی اس روشنی سے محروم رکھا گیا۔ برہمن طبقے کا ذریعۂ تعلیم سنسکرت زبان اور مذہبی کتب تک محدود تھا، اور وہی مذہبی رسومات کی ادائیگی اور نگرانی کے ذمہ دار سمجھے جاتے تھے۔اس طبقاتی تقسیم نے نہ صرف معاشرتی ناہمواری کو جنم دیا بلکہ مذہبی علم کو ایک مخصوص طبقے کی جاگیر بنادیا۔ یہ صورت حال اس بات کا اظہار ہے کہ کس طرح مذہب کے نام پر علمی وسائل کو محدود کر کے ایک طبقہ اپنی برتری اور دوسروں کی محکومی کو قائم رکھتا رہا۔ بعد ازاں جب انگریزی تعلیم نے سب کے لیے علم کے دروازے کھولے تو یہی قدامت پسند رویہ نئی سوچ کے ساتھ ٹکرایا اور یوں ایک بڑی مذہبی تہذیبی آویزش وجود میں آئی، جس نے برصغیر کے معاشرتی ڈھانچے کو ہلا کر رکھ دیا۔

مستنصر حسین تارڑ کے ناول جو افغانستان کی جنگوں اور نوّے کی دہائی کے بعد کے عالمی و علاقائی تبدیلی کے پس منظر میں لکھے گئے

ہیں، جہاد کو محض مذہبی جذبہ یا روحانی قربانی کے طور پر نہیں دکھاتے بلکہ اسے سیاسی، تاریخی اور تہذیبی ڈسکورس کے طور پر پڑھتے ہیں یعنی جہاد کا بیانیہ کس طرح سیاسی مفادات، بین الاقوامی سازشوں اور مقامی سماجی اضطراب کے ساتھ جُڑ کر تہذیبی کشمکش کو جنم دیتا ہے۔ تارڑ کے ناول، قلعہ جنگی سے اللہ بخش ایک پنجابی نوجوان ہے جو اپنی مسجد کے مولوی کی جہادی تقریروں سے متاثر ہو کر افغان جنگ میں شامل ہوتا ہے۔ اللہ بخش کا خاندانی مراثی کہلاتا ہے۔ یہ لوگ ہمارے معاشرے کا انتہائی غریب طبقہ ہوتا ہے۔ مذہب کے نام پر یہ لوگ زیادہ استعمال ہوتے ہیں، کیونکہ ان کے پاس اچھی زندگی گزارنے کے لیے سوائے مذہبی تسلیوں کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ اللہ بخش ایک دفعہ جمعہ کی نماز پڑھنے مسجد جاتا ہے، جہاں ایک افغانی آیا ہوا تھا جسے سب لوگ اللہ کا مجاہد بتا رہے تھے۔ اس افغانی نے بڑے دردناک قصے سنائے کہ افغانستان میں کفار بے چارے مسلمانوں پہ ظلم و ستم کر رہے ہیں۔ اس نے جہاد کے متعلق چند احادیث بھی سنائیں، پھر سب کو جہاد کی دعوت دی۔ اللہ بخش بھی اس کی پر سوز اپیل پر لبیک کہہ بیٹھا۔ اس کے علاوہ اللہ بخش قلعہ جنگی کے صحن میں موجود دوسرے جنگوؤں کو بتاتا ہے کہ اسے ایک "بونے" نے جہاد کے لیے بھیجا۔ اس بونے نے بھی اللہ بخش سے وہی کچھ کہا جو اس دن افغانی مجاہد کہہ رہا تھا۔ بونے نے اللہ بخش سے کہا:

> "جب وہ بولا تو اس افغانی بابے کی آواز میں بولا، جو اس دن چندہ مانگنے آیا تھا اس نے بھی وہی دردناک قصے سنائے، کافروں کے ظلم و ستم کی کہانیاں سنائیں شہادت کا مرتبہ بیان کیا اور کہنے لگا تم جہاد کرو اور اسلام پر قربان ہو جاؤ۔"(6)

مستنصر حسین تارڑ نے یہاں علامتاً اس دور کے مولویوں کو بونے کہا ہے۔ جو لوگوں کو اسلام کے نام پر استعمال کر رہے تھے۔ اللہ بخش بھی انہیں بونوں کا شکار ہو کر یہاں آ نکلا اللہ بخش وہاں سب کچھ چھوڑ کر، اکوڑہ خٹک پہنچ جاتا ہے۔ یہاں اکثر یت اللہ بخش جیسے غریب نوجوانوں کی ہوتی ہے۔ جن کو تین وقت کا کھانا، کپڑے جوتے اور سب سے بڑھ کر عزت مل رہی تھی۔ یہاں کوئی انہیں کمی کمین نہیں سمجھتا تھا نہ انہیں اپنے طنز کا نشانہ بناتا تھا۔

مستنصر حسین تارڑ نے بہاؤ میں صدیوں کی تاریخ کو ایک ناول میں سمیٹا ہے۔ اس میں مغربی پنجاب سندھ راجھستان کا ریگستان ہڑپہ موہنجوداڑو اور کالی ہنگن کی تہذیب اور ندیوں کے کنارے آباد بستیوں کا ذکر ہے۔ یہ سلسلہ 11000 ق م تک جاری رہا اور پھر فاتحین شمال مشرق ہندوستان میں پھیل گئے ان لوگوں نے دریائے گنگا کی تہذیب کی بنیاد ڈالی۔

مصنف نے ناول میں دراوڑوں اور آریوں کی آویزش کو آشکار کیا ہے۔ یہ ناول ہمیں سندھ گھاگھرا کے کنارے آباد ہزاروں سال پرانی بستی کی سیر بھی کراتا ہے۔ دریا کے خشک ہونے سے دراوڑوں کی ایک بستی پر بڑے بُرے اثرات مرتب ہوئے۔ خشک سالی کی وجہ سے قبائلی معاشرے کا معاشی ڈھانچہ منتشر اور پانی کی قلت سے ان کی زندگی برباد ہو گئی ہے اس بستی کا بنیادی پیشہ زراعت تھا۔ دودھ دینے والے جانوروں کو پالا جاتا۔ زراعت اور پرندوں کا شکار کر کے غذائی ضرورت کو پورا کیا جاتا۔ سرسوتی ندی کے پانی سے پورا محلہ سرسبز و

شاداب ہو جاتا تھا۔ زراعت کے علاوہ ظروف سازی بھی اس معاشرے کا ایک پیشہ تھا۔ مٹی کے برتنوں پر خوبصورت نقاشی کی جاتی تھی۔ مرنے کے بعد مردے کو بڑے برتن میں رکھ کر دفنا دیا جاتا تھا۔ اس معاشرے میں کھیت، مویشی اور زمین وغیرہ مشترکہ جائیداد تصور کیے جاتے تھے۔ عورتوں کا ایک وقت میں کئی مردوں سے جسمانی تعلق رکھنا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پانی نہ ہونے کی وجہ سے زراعت ممکن نہ تھی اناج کے ذخائر بالکل ختم ہو چکے تھے۔ لوگ پرندوں اور مچھلیوں سے پیٹ پال رہے تھے۔ بستی کے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کریں اور اپنی صبح، دوپہر اور شام کو کیسے گزاریں خشک سالی سے ساری زندگی تبدیل ہو چکی تھی۔ اناج کے محدود ذخائر ختم ہو چکے تھے۔ لوگ جنگلی بیر اور پھلوں پر گزر بسر کر رہے تھے۔ دریا کی خشکی نے معاشرے کی تمام زندگی کو متاثر کر دیا۔ اس بستی کا قدیم مذہب شیولنگ کی پوجا کرتا تھا۔ کئی برسوں کے انتظار کے بعد جب دریائے سرسوتی میں پانی نہیں آتا تو مقامی باشندوں کا اپنے معبود پر سے اعتقاد اٹھ جاتا ہے اور کچھ سر پھرے اسے پاش پاش کر دیتے ہیں:

> "انہیں دنوں جب دھرو اپانی لینے کو جا رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ لینگ ٹیلے کے قریب لنگ کے ٹکڑے پڑے ہیں کسی نے اسے توڑ دیا تھا۔۔۔ اس نے لینگ کے ایک ٹکڑے کو اٹھا کر آنکھوں سے لگایا اور پھر پھینک دیا۔۔۔ جو لینگ مینہ نہ برسائے وہ کسی کام کا۔"(7)

یہ منظر مذہبی تہذیبی آویزش کی نہایت گہری اور علامتی تصویر پیش کرتا ہے۔ قحط سالی نے جب زمین کو سوکھا دیا، کھیت بنجر ہو گئے، دریا خشک ہو گئے اور انسان بھوک و پیاس سے نڈھال ہو گیا، تو لوگوں کا ایمان بھی ہلنے لگا۔ وہی لوگ جو برسوں سے شیولنگ کو معبود سمجھ کر اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتے، پھول چڑھاتے، جل چڑھاتے اور بارش کی دعائیں مانگتے تھے، جب قدرت نے ان کی التجاؤں کا جواب نہ دیا تو ان کا عقیدہ بکھرنے لگا۔ آخر کار انہوں نے اپنے ہی معبود کو توڑ ڈالا۔ ایک علامتی بغاوت کے طور پر، اس تصور کے خلاف جو ان کے مذہبی و تہذیبی شعور میں رچا بسا تھا یہ عمل دراصل مذہبی آویزش کی وہ صورت ہے جس میں عقیدہ اور تجربہ آمنے سامنے آجاتے ہیں۔ عقیدہ کہتا ہے کہ معبود طاقتور ہے، لیکن تجربہ کہتا ہے کہ فطرت کے قوانین کسی بھی انسانی یا خود ساختہ دیوتا سے بالاتر ہیں۔ یہی تضاد انسانی تاریخ میں بارہا ابھرتا رہا ہے۔ جب مذہب کی تعبیرات زندگی کی عملی مشکلات کا سامنا کرنے میں ناکام رہتی ہیں تو انسان ان سے بغاوت پر اتر آتا ہے یہ واقعہ اس امر کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ مذہبی تہذیب اگر جامد ہو جائے اور انسان کی عملی زندگی، اخلاق اور فطرت سے کٹ جائے تو وہ اپنی روحانیت کھو دیتی ہے۔ اس بغاوت میں محض مذہب سے انکار نہیں بلکہ ایک نئی فکری جست موجود ہے۔ کہ عبادت محض رسمی عمل نہیں بلکہ انسان اور قدرت کے مابین ایک بامعنی تعلق ہونا چاہیے یوں یہ منظر مذہبی تہذیبی آویزش کی بنیادی علامت بن جاتا ہے، جہاں روایتی عقیدہ اور انسانی شعور کی بیداری آمنے سامنے آتے ہیں اور اسی تصادم سے مذہبی و تہذیبی ارتقا کا نیا مرحلہ جنم لیتا ہے۔

حوالہ جات

1. عبداللہ حسین: "اداس نسلیں" بسمہ کتاب گھر، دہلی، 2012ء، ص405
2. قرۃالعین حیدر: "آگ کا دریا" ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوسنگ، دہلی، 2005ء، ص566۔567
3. ایضاً، ص571
4. ایضاً، ص569
5. ڈاکٹر ارشد اقبال: "اردو مختصر افسانہ میں سماجی عناصر" بھٹو پرنٹنگ پریس، لاہور، 2020ء، ص62
6. ایضاً، ص63
7. مستنصر حسین تارڑ: "بہاؤ" سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1992ء، ص237

Romanized References

1. Hussain, A. (2012). *Udaas Naslein* [Weary Generations]. Bisma Kitab Ghar. p. 405.
2. Hyder, Q. (2005). *Aag Ka Darya* [River of Fire]. Educational Publishing House. pp. 566–567.
3. Ibid., p. 571.
4. Ibid., p. 569.
5. Iqbal, A. (2020). *Urdu Mukhtasir Afsanay Mein Samaji Anasir* [Social Elements in Urdu Short Stories]. Bhutto Printing Press. p. 62.
6. Ibid., p. 63.
7. Tarar, M. H. (1992). *Bahao* [Flow]. Sang-e-Meel Publications. p. 237.